OPEN ACCESS
IRJRS
ISSN (Online): 2959-1384
ISSN (Print): 2959-2569
www.irjrs.com

برصغیر میں اردو ادب کی فکری روایت

PHILOSOPHICAL TRADITION OF URDU LITERATURE IN SUBCONTINENT

Dr. Shazia Sajid
Assistant Professor (Urdu Department) Kinnaird College for Women, Lahore.
Email: shazia.sajid@kinnaird.edu.pk
https://orcid.org/0009 - 0001- 5200- 0100

Abstract

This article delves into the depths of Urdu language and literature in the Indian subcontinent, shedding light on the transformative journey of the philosophical traditions of the society.The term 'philosophical tradition' reflects the collective cognitive process of a community, influenced by various factors such as social, economic, communal, and political contexts. These external factors shape the perspectives and ideas that form the communal philosophical thinking within a specific group.This article attempts to explain the evolution of this philosophical tradition and its impact on the larger community.Literature is a vital and indispensable aspect of any community. It provides a reflection of the character and values of society. Simultaneously, literature plays a crucial role in shaping and influencing the community it belongs to. Modern era academicians recognise that literature serves as a repository of knowledge and collective memory, preserving cultural heritage and history. In doing so, it also comes to serve as a record of the philosophical evolution of social groups and communities. The Urdu language began its development in the Indian subcontinent with the introduction of Islamic teachings in the region. This article traces the evolution of Urdu from its early stages to its recognition as a prominent literary language. The article discusses the literary development of the Urdu language up to the British era.

***Key Words**: Urdu language, Indian subcontinent, philosophical tradition, literature, Islamic teachings.*

موضوع کا تعارف

CC BY

معاشرے میں ہر طرح کی سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیاں افراد معاشرہ کے " نظام خیالوں تشکیل دیتی ہیں۔ اس آرٹیکل میں اردو زبان وادب کے ارتقائی عہد کو اسی نظام خیال یا "فکر" کی روشنی میں تحقیق کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ اس سے بات ثابت ہوتی ہے کہ ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔

اس موضوع کے تحت لکھنے کے لیے تین مراحل طے کیے جائیں گے۔

- سب سے پہلے "فکری روایت" کی وضاحت کی جائے گی۔
- برصغیر میں پنپنے والی "فکری روایت" کو جاننے کے لیے اس خطے کے معاشی، معاشرتی اور سماجی حالات کو تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے گا۔
- ان تاریخی حالات وواقعات کی روشنی میں یہاں کی فکری روایت کے اردو ادب پر اثرات کا ادوار کی ترتیب سے جائزہ لیا جاے گا۔

فکری روایت:

"فکری روایت" سے مراد کسی معاشرے کا وہ "نظام خیال" جو بیک وقت افرادِ معاشرہ کی ایک کثیر تعداد کو اپنے زیرِ اثر کیے ہوتا ہے۔ ایک خطے کے مخصوص معاشرتی، معاشی، سماجی اور سیاسی حالات و مسائل لوگوں کے ایک بڑے گروہ کو سوچنے کے انداز میں مماثلت سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔

ہر دور اپنے منفرد اور مخصوص حالات کے باعث اپنا "نظام خیال" خود تشکیل دیتا ہے۔ اس کو پروان چڑھانے والا دور اس کو ساتھ لیے ہوئے چلتا ہے لیکن نئے آنے والے دور کے لیے یہ بے روح ہو جاتا ہے۔ نیا دور پھر سے اپنی "فکری" کی نہج معین کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اکثر معاشروں میں اس نئی "فکر" کا راستہ ادیب اور شعراء بہت پہلے ہی دکھانے لگ جاتے ہیں کیونکہ فنکاروں کی جماعت حساس افراد پر متشمل ہوتی ہے۔ جو مستقبل بینی کی طاقت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں معاشرے کی اجتماعی سوچ کو جگہ دیتے ہیں۔ اس طرح انسانی معاشرے سے ادب کا رشتہ گہرا اور مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالتی کہتے ہیں:

"ادب کا کام زندگی کو آگے بڑھانا اور یہی ادب اور معاشرے کا گہرا بنیادی رشتہ ہے۔ اسی رشتے سے حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور اسی حوالے سے ادیب اور مملکت کا مثبت تعلق قائم رہتا ہے اور ادیب کی آواز معاشرے کی ضمیر کی آواز بن جاتی ہے۔

شعراء اور ادبا کی جماعت ہی کسی معاشرے کی "اجتماعی فکری روایت" کی نمائندہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کو کسی بھی دور کا عکاس کہا جاتا ہے۔ فرد کے نظریات اور عمل کو بیک وقت متاثر کرنے والے تمام معاشرتی عوامل اس کی

"فکر" کو شکل دیتے ہیں اور ہم ادب کے مطالعے سے ان سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب کی تاریخ معاشرتی تاریخ کے ساتھ مل کر برصغیر کی فکری روایت تک پہنچے گی۔

برصغیر اور اس کی فکری روایت:

برصغیر کی فکری روایت کو تلاش کرنے کے لیے "اردو" کے ابتدائی دور میں اس خطے کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کا مختصر جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ فرد کی زندگی میں بیک وقت کئی عوامل مل کر اس کی تشکیل دیتے ہیں۔ برصغیر ہمیشہ سے "کثیر الثقافت" خطہ رہا ہے۔ جہاں تک تحقیق نے اس خطے کی تاریخ تک رسائی حاصل کی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ثقافتوں کی یہ رنگارنگی ہمیشہ سے ہی ہے۔ مختلف وقتوں میں دنیا کے مختلف حصوں سے حملہ آور اس زرخیز خطے کو فتح کرنے کی غرض سے آتے رہے جو اپنے معاشرے اور تقاضوں کے اثرات یہاں چھوڑتے چلے گئے۔ جس کی وجہ سے یہاں آباد مختلف اقوام نے ان کو جذب کیا اور یہ ایک "کثیر الثقافت" معاشرہ بن گیا۔ مسلم فاتحین کی آمد کا سلسلہ محمد بن قاسم (۷۱۲ء) سے شروع ہوا اور یہاں اسلامی ثقافت مقامی ثقافت کے ساتھ شامل ہو گئی۔

ثقافت کا تعلق خالصتاً مقامیت سے ہے۔ اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سب سے اہم فلسفۂ حیات ہے۔ فرد کو فلسفۂ حیات عموماً مذہب ہی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ثقافت کا بنیادی جزو مذہب ہے۔ زبان، موسم، طرزِ معاشرت، مقامی رسم و روایت یہ سب بعد میں آتے ہیں۔ مذہب انسان کا اولین رہنما بھی ہے۔ اسی لیے ہر معاشرے کے افراد ایک یا ایک سے زیادہ مذاہب پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

اس طرح زبان فرد کی بنیادی ضرورت ہے۔ اپنا مدعا، تائید و تردید دوسروں تک پہنچانے کے لیے اسے ایسے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جو مد مقابل بھی سمجھ سکے۔ اکثر ایک خطے کے لوگ ایک ہی زبان بول رہے ہوتے ہیں لیکن اگر برصغیر کی طرح مختلف مقامات پر مقامی بولیاں رائج ہوں تو ایسے میں ایک زبان ایسی ضرور ہوتی ہے جس کو اس خطے کے باسی سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ برصغیر میں "اردو" کی یہ مشترکہ حیثیت تیرہویں صدی سے نظر آتی ہے۔

اُس دور کے معاشرے پر تصوف کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ نوزائدہ زبان میں تخلیق ہونے والا ادب بھی صوفیا کے ملفوظات پر مبنی تھا۔ اردو زبان کے قدیم ترین نمونے ہمیں انہی صوفیا کے ملفوظات میں دکھائی دیتے ہیں۔

مسلم فاتحین کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے لگا تو مقامی زبانوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی شامل ہونے لگے۔ عہد جہانگیر تک اگرچہ سرکاری زبان فارسی ہی تھی بلکہ علم و ادب کی زبان بھی فارسی ہی تھی مگر عوامی سطح پر دکن سے لے کر شمالی ہند تک ایک نئی زبان جنم لے چکی تھی جس کی رسائی ابھی دربار تک نہ تھی مگر قبول عام حاصل ہو چکا تھا اس زبان کو مختلف علاقوں میں مقامی طور پر مختلف نام دیئے گئے مگر اصل صورت اس کی تھی۔ دکن میں یہ دکنی پھر ہندوی اور شمالی ہند

میں یہ اردو کہلائی۔ اردو زبان کی طفولیت کا زمانہ فارسی کا بھرپور شباب کا تھا۔ اس لیے اردو کے ابتدائی ادب فارسی کے زیر اثر نظر آتا ہے اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔

اردو زبان کی طفولیت کا زمانہ فارسی کا بھرپور شباب کا تھا۔ اس لیے اردو کے ابتدائی ادب فارسی کے زیر اثر نظر آتا ہے اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ دنیا کے ہر ادب کی طرح اردو ادب کی ابتدا بھی شعر سے ہوئی۔ شعر اور ترنم کی تاثیر مستند ہے۔ اس لیے ہر ادب کے آغاز میں دوسروں کو مرعوب و متاثر کرنے کی غرض سے فنکاروں نے شعر ہی کا سہارا لیا۔

اردو ادب کے ابتدائی دور کے دُھندلکے میں ہمیں امیر خسرو ایسے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ جنھوں نے بے شمار فارسی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ اردو الفاظ کو پہلی بار اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ وہ متعدد شاہان دہلی مثلاً غیاث الدین بلبن اور معیز الدین کیقباد کے دور حکومت میں دربار سے منسلک رہے اور قدر منزلت حاصل کی یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں تصوف عام تھا۔ طریقت و شریعت عوام کے لیے ذریعہ سکون و نجات تھا۔

امیر خسرو بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ان کو اپنے مرشد سے گہری عقیدت تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی وفات کے چند روز بعد ہی آپ بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ امیر خسرو کو اگرچہ اردو کا باقاعدہ شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ان کی حیثیت ایک موجد کی سی ہے۔

ان کے بعد دکن کے شعرائے اردو کے منظر عام آنے تک تقریباً تین صدیوں کا فاصلہ ہے مگر اس زبان نے ان تین صدیوں میں نہ اپنے آپ کو منظم کیا اور نہ ہی کوئی علمی و ادبی مقام حاصل کیا مگر اس کو دوران روحانیت کی طرف مائل افراد نے اسے اپنائے رکھا۔ صوفیا یا صوفی ازم کا محور انسان اور ان کا عمل انسان دوستی۔ معاشرے کو بھی وہ انسان دوستی کا درس دیتے اور خود بھی یہ وطیرہ اپنایا۔

برصغیر کے عوام کو بلا امتیاز مذہب، رنگ و نسل گلے سے لگایا۔ اپنی تعلیمات کو ان تک پہنچانے کے لیے ان صوفیوں اور علمائے دین نے انہی کی زبان اپنی تصانیف میں استعمال کی۔ عوام کی زبان چونکہ اردو تھی اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کا ابتدائی شعر یا نثری سرمایہ مذہبی تصانیف ہی کی شکل میں ہے۔ یہ مذہبی تصانیف محض اسلامی تصانیف تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ ہندومت سے تعلق رکھنے والے مذہبی رہنمائوں نے بھی تصوف کو اپنایا۔ ہندومت کے بھجن جو "کبیر" اور بابا تلسی داس نے لکھے ان میں اردو کے بے شمار الفاظ استعمال کیے گئے۔ مگر ان سب میں سے اردو کی قبولیت کا اولین اعزاز امیر خسرو کو ہی حاصل ہے۔

سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھنے والے اس صوفی نے دوہے اور نظم کی اصناف کو اپنایا۔ مولوی عبدالحق ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

"امیر خسرو وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے زمین ہند میں اس زبان کا بیج بویا۔ جو بعد میں ریختہ، اردو یا ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوئی"۔ (2)

امیر خسرو کے بعد دکن میں اردو ادب کی باقاعدہ بنیاد پڑی۔ جیسا کہ رام بابو سکسینہ نے لکھا:

"امیر خسرو کے زمانے میں اگر اردو نے ادبی مقام پر آنکھ کھولی تو شاہان گولکنڈہ اور بیجاپور کے دور میں اس کو ایک ادبی مقام حاصل ہو گیا۔ محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ وغیرہ شعر و شاعری کے بڑے قدر دان تھے۔ وہ خود بھی دکنی میں شعر کہتے ہیں۔"(3)

اٹھارویں صدی کے ابتدائی عشرے میں جب ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچا تو عام اہل علم و فن کی نظر التفات کے علاوہ اس کو قبول عام بھی حاصل ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب درباری زندگی عروج پر تھی۔ بادشاہ اور بادشاہ کا دربار ہر خاص و عام کی توجہ کا مرکز تھا۔ اہل فن بھی فن کی داد اور جاہ و منزلت کی چاہ میں درباروں کا رُخ کرتے اور اکثر بادشاہوں کی تعریف و توصیف کر کے انعام و اکرام پاتے۔ ایسے میں مروجہ زبان کی شاعری میں قصیدے اور مثنوی نے خوب رواج پایا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ اردو زبان جو ایک لمبے عرصے سے اپنا وجود تو رکھتی تھی مگر ادبی حیثیت نہ تھی۔ اس عوامی زبان کو صوفیاء نے تعلیم و تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ مولوی عبد الحق بھی اپنی تحقیق سے ثابت کرتے ہیں کہ اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما درباریوں میں نہیں بلکہ فقیروں کی خانقاہوں اور تکیوں میں ہوئی اور وہیں سے اس کو مقبول عام اور خصوصی اہمیت بھی حاصل ہوئی۔ یہ تمام صوفیاء اور علمائے اکرام علم و حکمت میں فضیلت رکھنے کے باوجود تعلیم و تبلیغ کے لیے عربی یا فارسی کا استعمال نہیں کیا بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ان کا طریق کار یہی رہا کہ جہاں گئے وہاں کی عوامی زبان میں اپنی تبلیغ کو جاری و ساری کیا۔ سرزمین ہند پر اپنی تصنیف میں اس زبان کو استعمال کرنے والے پہلے صوفی حضرت معین الدین چشتی تھے۔ ان کے بعد پھر یہ سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ بو علی قلندر نے بھی اردو زبان کو استعمال کیا۔

اردو کی ادبی تاریخ کی یہ مستند حقیقت ہے کہ اس کو سب پہلے دکن میں فروغ حاصل ہوا اور اسے باقاعدہ ایک ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کیا گیا۔ اگرچہ وہاں دکنی کہلائی۔ مسلم فاتحین مثلاً محمود غزنوی اور محمد غوری وغیرہ نے گجرات پر متعدد حملے کیے لیکن ایسا حملہ آور جس کے ورود سے یہاں کی زبان، تہذیب و تمدن اور کلچر و معاشرے کو متاثر کیا۔ وہ علائو الدین خلجی تھا۔ اس نے ۱۲۹۲ء میں یہاں حملہ کیا اور ۱۳۱۰ء تک خلجی سلطان نے مالوہ دکن کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ یہ علاقے چونکہ دلی سے دور تھے اس لیے بسلسلہ انتظام علائو الدین خلجی نے یہاں ترک سرداروں کو حکمران بنا دیا۔ اس طرح یہ لوگ ایک لمبا عرصہ دکن میں مقیم رہے۔ محمد تغلق نے جب دارالسلطنت دہلی کے بجائے دیوگری کو بنایا تو جلد ہی واپس دہلی آ گیا۔ جب کہ اس کے ساتھ جانے والے بہت سے مسلم خاندان وہیں آباد ہو گئے۔ جب تغلق کی حکومت

کمزور پڑی تو یہ علاقہ تین ریاستوں میں بٹ گیا۔ احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت، بیجاپور میں عادل شاہی اور گولکنڈہ میں قطب شاہی حکومت بن گئی۔

ان ریاستوں میں قطب شاہی سلطنت کو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بہمنی بادشاہ بڑے علم پرور اور ادب نواز تھے۔ ان کی اسی خوبی کی وجہ سیاہل علم و فضل اور شعراء ادیب اس طرف کا رُخ کرنے لگے۔ خاص طور پر اس حکومت کو دوسری صدی میں اردو کو مقام تو حاصل ہوا اس کا معیار بھی اعلیٰ ہو گیا۔ عادل شاہی دور کی پہلی صدی میں اردو کی ترقی میں فارسی اور شیعہ اثرات حائل رہے۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان ایرانی اثرات کو کم کرنے کے لی فارسی کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا لیکن دوسری صدی کے آنے تک اردو نے فارسی کے ساتھ پروان چڑھنا شروع کر دیا تھا بلکہ اردو کی مقبولیت سے متاثر ہو کر بعض ایرانی شعراء نے بھی اس کو اپنی تخلیقی زبان کے طور پر استعمال کیا۔ ان سلاطین کی سرپرستی اور قدردانی سے اردو زبان کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ عام لوگ بھی اس کی شعر و شاعری میں دلچسپی لینے لگے اور اس کی ترقی کی مزید راہیں ہموار ہوتی چلی گئیں۔ یہ زبان جو تقریر سے نکل کر تحریر کی زبان بن چکی تھی۔ اس میں باقاعدہ تصانیف و تالیف کا آغاز ہوا۔ بیجاپور، بہمنی سلطنت میں شامل اور صوفیا کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس طرح عادل شاہی حکومت سے پہلے ہی اردو زبان کی جڑیں اس سرزمین میں موجود تھیں۔ علماء کے مقابلے میں صوفیاء نے اس میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ ان کے مخاطب عوام تھے اور عوام کی زبان میں تعلیم و تبلیغ ہی مناسب تھی۔ یہاں کے قدیم بزرگوں میں شیخ عین الدین گنج العلم کا قیام بھی بیجاپور میں تھا۔ وہ دکنی یعنی اردو ہی میں خطاب کرتے اور لکھتے۔ ان کے مریدوں نے بھی اسی زبان میں تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ بیجاپور کے صوفیاء کا دوسرا سلسلہ بندہ نواز گیسو دراز کے مریدوں کا ہے۔ خواجہ نواز نے اسی زبان کو رُشد و ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ بیجاپور کے صوفیاء کا تیسرا اہم سلسلہ میراںؒ جی شمس العشاق کا ہے۔ بندہ نواز گیسو دراز کے ملفوظات اور شمس العشاقؒ کی تصانیف آج بھی موجود ہیں، انہی بزرگوں کا چوتھا گروہ صبغتہ اللہ کا ہے انہوں نے بھی دکنی کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ گجرات بیدر، گلبرگہ، شمالی ہندوستان، ایران اور عرب کے مختلف اللسان اور مختلف المشرب صوفیا نے یہاں مختلف وقتوں میں بیجاپور کو اردو کا مرکز بنایا۔

عادل شاہی دور میں شمالی ہندوستان سے تعلقات ہو جانے سے لسانی اور تمدنی قربت بھی ہونے لگی اور اس دکنی کی شکل آہستہ آہستہ نکھرنے لگی۔ شمالی ہندوستان میں اردو کے ابتدائی دور کے جائزے کے لیے اکبر کے دورِ حکومت سے آغاز کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس سے پہلے باقاعدہ کوئی ایسی مذہبی یا سیاسی تحریکیں نہیں ملتیں جنہوں نے معاشرے کو کسی "اجتماعی نظام فکر" سے ہم آہنگ کیا ہو۔

ہندوستان میں مغلیہ دورِ حکومت میں سے اکبر کے دور میں جنم لینے والی مذہبی تحریکات نے نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں اہم حیثیت حاصل کی بلکہ اس وقت کے صوفیاء اکرام نے احیائے دین کی جو کوششیں کیں۔ ان سے عوام کے

اندر روحانیت اور مذہب کی طرف مائل ہونے کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ اکبر کے دور میں فنون لطیفہ نے خوب ترقی کی۔ خصوصاً فن شعر، موسیقی اور مصوری کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اسی دور میں سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی اور یونانی وغیرہ کے بہترین ذخائر کے تراجم کیے گئے۔ رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، اھتر وید اور ریاضی کے کتاب لیلاوتی کے تراجم بھی گراں قدر اضافے ہیں۔ اس دور میں تلسی داس اور عبدالرحیم خانِ خاناں جیسے عظیم شعراء بھی سامنے آئے۔ اس عہد میں تصوف کو پہلے سے کہیں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ کیوں کہ اکبر کے "دین الٰہی" کے نفاذ کے بہت سی مذہبی قوتیں احیائے مذہب کے لیے میدان عمل میں آگئیں۔ ان صوفیاء اور مذہبی علماء نے لوگوں کو اکبر کے دین الٰہی کی خرافات سے محفوظ رکھنے کے لیے اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ تیز تر تو کیا ہی تھا، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے شریعت اور طریقت کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی عوام کو مائل کیا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اس وقت کی معروف ہستی ہیں جن کے مرشد باقی باللہ کے کہنے پر انہوں نے صوفیاء کے تمام سلسلوں کے علوم حاصل کیے۔ مجدد الف ثانیؒ راسخ العقیدہ صوفی تھے۔ ان کی سخت مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے ہندو اور مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ تصوف کرنے لگے۔

ان سے پہلے اکثر صوفیاء ایران اور عراق سے سرزمین ہند کی طرف آئے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا تعلق بغداد (عراق) سے تھا جبکہ سہروردی اور چشتی سلسلے کے صوفیاء خراسان اور چشت سے تشریف لائے۔ نقشبندی ماورالہنر (ازبکستان، تاجکستان وغیرہ) سے آئے۔ یہ تمام صوفیاء نظریہ وحدت الوجود کے حامی اور شریعت پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ ان تمام سلسلوں میں آپس میں کوئی نظریاتی یا کئی بڑا اختلاف نہیں تھا۔ چند جزوی اختلافات تھے جو زیادہ اہمیت کے حامل نہ تھے مگر اکبر کے دور میں مجدد الف ثانیؒ نے نظریہ وحدت الشہود کو فروغ دیا۔ جس کے رد عمل میں وہابی تحریک کی بنیاد پڑی۔ جہانگیر کے عہد میں سلسلہ نقشبندیہ عروج پر تھا مگر شاہ جہاں کے زمانے میں سلسلہ قادریہ کا سورج پھر سے چمکنے لگا۔ حضرت میاں میر قادریؒ اُس عہد میں اس سلسلے کے سب سے اہم صوفی تھے۔ دارالشکوہ نے "سفینتہ الاولیاء" میں ان کا ذکر کیا ہے۔

شاہ جہاں بھی ان کا مرید تھا۔ اُس کے عہد میں وحدت الوجودی نظریات کے ساتھ ہندو ویدایت کا فلسفہ بھی شامل ہو گیا۔ اکبر کے زمانے میں جن ہندو مذہبی کتب کے تراجم ہوئے ان کی وجہ سے آزاد خیال صوفی اسلام اور ہندو موت میں مماثلتیں ڈھونڈنے لگے اور دونوں مذاہب کے درمیان تفاوت ختم کرنے کی کوشش بادشاہ وقت کے ایما پر ہوئیں۔

مگر اورنگزیب عالمگیر کے تخت نشین ہوتے ہی خلاف شرع طریقوں اور بدعتوں کی سختی سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کے عہد میں کوئی بڑی مذہبی تحریک سرگرم عمل دکھائی نہیں دیتی۔ دوسرے علوم و فنون میں قابل قدر ترقی نہیں ہوئی جیسا کہ ڈاکٹر عابد حسین نے بھی اسے ذہنی جمود کا زمانہ قرار دیا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد عرب میں محمد بن عبد الوہات کی تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ اٹھارویں صدی کی تیسری دہائی میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات نے ہندوستان میں احیائے مذہب کا فریضہ سرانجام دیا۔ وہ ایک جید عالم تھے۔ ان کے زمانے میں بھی عام رجحان تصوف کی جانب تھا مگر مقامی ہندو اثرات کے باعث قبر پرستی اور پیر کو رکوع و سجود جیسی بدعتیں اور خلافِ شرع باتیں اس میں شامل ہو گئی تھیں۔ شاہ صاحب نے تصوف کی اصلاح کی اور اس کو شرع کے قریب تر کر دیا۔

یہ وہ دور تھا جب تصوف کے رنگ میں رنگی اردو شاعری شباب کی اولین منازل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ برصغیر میں مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ یہ زمانہ معاشی اور سیاسی ابتلا کا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد سیاسی افراتفری اور زبوں حالی کا آغاز ہوا۔

عالمگیر کے بیٹوں محمد اعظم، محمد معظم اور شاہ عالم میں حصول اقتدار کے لیے جنگ شروع ہو گئی آخر کار بادشاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت کی جنگ جیت کے حکمران بن گیا۔ ۱۷۱۲ء میں اس کی وفات کے بعد جہاں دار شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ۱۷۱۳ء میں سازش کا شکار ہوا اور فرخ سیر بادشاہ بن گیا۔ فرخ سیر کے بعد صرف سات ماہ کے دوران ''سید برادران'' کی سازشوں کے تحت رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ تخت پر بیٹھے۔ ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ تخت نشین ہوا۔ جو تاریخ میں ''رنگیلا'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ میں یہ قابل ذکر دور ہے مگر سیاسی طور پر حالات انتہائی پست تھے۔ محلاتی سازشوں نے عوام کا سکون بھی برباد کر رکھا تھا۔ امراء وزراء کے حسد و نفاق کے باعث معمولی باتوں پر تلواریں چل جاتیں۔ اسی دوران جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں نے سر اٹھایا۔ اب برصغیر میں موجود معاشرے میں ہر طرف انارکی، بے چینی اور عدم تحفظ کی فضا تھی۔ جیسا کہ نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں:

''عالمگیر کے بعد یہ ڈیڑھ سو برس گویا ایک بیمار کے بھیانک اور ڈرائونے خواب پریشان ہیں۔ جن میں فسادات، بد نظمی انتشار اور ہر چیز اُلٹی سیدھی نظر آتی ہے۔''(4)

اسی دور میں ہندوستان میں ہر طرف مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں نے بغاوت کر دی۔ نادر شاہ بربریت اور ناانصافی کی انتہا پر پہنچ گیا۔ جس نے لٹیروں کی طرح دہلی کو لوٹا اور قتل عام کیا۔ اس کے جانے کے بعد حکومت کے مزید ٹکڑے ہو گئے۔

۱۷۵۴ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اس کے حامی گروہوں میں ایرانی اور افغانی تھے جب کہ مخالف میں مرہٹے، سورج مل جاٹ تھے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے مقام پر بڑا معرکہ ہوا۔ مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس فتح کے بعد شاہ ابدالی اپنے منظور نظر مقامی لوگوں کے سپرد نظام حکومت دے کر واپس افغانستان چلا گیا۔

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے بعد بنگالی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آگیا۔ کچھ ہی عرصے میں یہ حکومت مشرقی صوبوں تک پھیل گئی اور انگریز (برطانوی حکومت) کی باقاعدہ عملداری شروع ہو گئی۔ ۱۷۰۶ء میں لگا۔ جب غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم ثانی کو اندھا کر کے تخت سے محروم کر دیا۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی اقتدار کے پنجے پھیلاتے ہوئے آہستہ آہستہ دہلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں مرہٹوں اور کمپنی نے مل کر ٹیپو سلطان کو شکست دے دی۔ اب تک صرف دکن کی حکومت ان تمام ریشہ دوانیوں سے محفوظ تھی۔

اٹھارویں صدی کا آخری دور اور انیسویں صدی کا آغاز برصغیر میں انسانی قدروں کا زوال تھا۔ معاشرہ زوال پذیر تھا۔ اس افراتفری اور سراسیمگی کے عالم میں عام انسان کا رُخ پھر داخلیت کی طرف مڑ گیا اور تصوف ایک بار پھر معاشرے کا اجتماعی رویہ بن گیا۔ صوفیا کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اسلام نے چونکہ شروع سے ہی ہندومت کو متاثر کیا۔ اس بار اسلام پوری شدت سے ہندومت پر اثرانداز ہوا۔ بہت سے ہندو و مذہبی رہنمائوں نے اسلام کی روحانی تعلیمات کا فیض لینے کے لیے مسلم صوفیاء کی مریدی شروع کر دی۔

ہندومت کے ایک رہنما شری شنکر اچاریہ نے بھگتی تحریک کی بنیاد شمالی ہندوستان میں ڈالی۔ رامانج اور شنکر اچاریہ نے مل کر اس کے عقائد کا پرچار کیا۔ اُن کے عقیدے کے مطابق خدا تک رسائی کے لیے جسمانی یا روحانی ریاضتوں کی ضرورت نہیں بلکہ صرف محبت اور بھگتی سے خدا (جو کہ محبوب کی حیثیت رکھتا ہے) کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کے غلط عقائد کی ترویج روکنے کے لیے سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید نے اپنی خدمات پیش کیں۔

مولانا اسماعیل شہید کا اردو میں بھی ایک مقام ہے کیونکہ انہوں نے اپنی اہم تصانیف ''تقویت الایمان'' اور ''صراط مستقیم'' اسی زبان میں لکھیں۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''ان کی اہم ترین کتاب ''تقویت الایمان'' ہے جو انہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی۔ جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں گھٹنوں بھی چلنا نہیں آتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب کہ اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں۔ ایک صاحب کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا۔''(5)

اردو کے شاعر مومن خان مومن انہیں کے پیروکار تھے۔ ان کی مثنوی ''جہادیہ'' ان کے نہی عقائد کی عکاسی ہے۔ مولانا احمد سید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی وفات کے بعد اہل حدیث کا ایک نیا مسلک پیدا ہو گیا۔ وہابی اور اہل حدیث کے رد عمل میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے تمام حنفی عقائد یعنی گیارہویں شریف، ختم، پیر پرستی اور میلاد وغیرہ کو پھر سے زندہ کر دیا۔

انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پورے برصغیر پر انگریز کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ اب وہ یہاں کے عوام کو اپنی تہذیب کی طرف مائل کر رہا تھا۔ ایسے حالات پیدا کیے جا رہے تھے کہ عوام کے گرد ایسا حلقہ تنگ کر دیا جائے کہ وہ خود

انگریزی تہذیب اپنالیں۔ ہندوستانی معاشرہ ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ نئی تہذیب، نئے حکمران اور نئی روایات کو اپنانے یا رد کرنے کی کشمکش۔ متوسط طبقے کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ جن کی بہتری کے لیے سرسید، حالی اور شبلی جیسے رہنما میدان عمل میں آگئے۔ جنہوں نے عوام کو نئے علوم کے حصول اور نئے حکمرانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لیے قائل کیا۔ ایسے میں ہندوستانی عوام تین طرح کی سوچ کے حامل ہو گئے۔

☆ اوّل جو نئی تہذیب کے بالکل خلاف تھے۔

☆ دوم جو جدید علوم اور نئی تہذیب کو مظہب سے متصادم خیال کر رہے تھے۔

☆ سوم جو خود بھی زمانے کے ساتھ چل رہے تھے اور باقی سب کو ایسا کرنے کے لیے قائل کر رہے تھے۔ سوچ کے مختلف زاویوں نے عوام کو طبقات میں بانٹ دیا تھا۔

اُردو ادب پر اثرات

اردو ادب کے دورِ طفولیت سے عنفوانِ شباب تک برصغیر کے تمام معاشرتی، سیاسی اور معاشی حالات کی تفصیل دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کسی بھی زبان کے ادب کو اس کے معاشرتی پس منظر سے الگ رکھ کر نہیں پرکھ سکتے کیونکہ فرد اور معاشرہ مل کر اُسے تخلیقی مواد فراہم کرتے ہیں جیسا کہ پروفیسر احمد نے کہا:

"ہر مصنف کی تصنیف پر اُس کی روزمرہ کی زندگی اور بدلتے ہوئے حالات کا بہت اثر ہوتا ہے۔ یہ حالات نہ صرف کارِ معاش کی دشواریوں، کھانے پینے کی ضروریات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ دماغی جدوجہد اور جذباتی زندگی سے بھی وابستہ ہیں۔"(6)

حقیقت تو یہ ہے کہ تخلیقیقت کو مواد فراہم کرنے والی تخیل کی قوتیں بھی خارجی حقائق سے ہی جلا پاتی ہیں۔ البتہ فنکار کے تخیل کی تربیت اور مہارت اس کی شکل کو مزید نکھار کر نظم کر دیتی ہے۔ اس طرح تخلیق ادب پارہ بن جاتی ہے نہ کہ اخباری رپورٹ جو بعینہ نقل کر دی جائے۔ فنکار کا ذہن اپنے ارد گرد سے چھوٹے چھوٹے اجزاء اکٹھے کرتا ہے اور ان کو مرتب و منظم کر کے فن پارے کی شکل دے دیتا ہے۔

برصغیر کی سیاسی اور متصوفانہ تحریکوں کے مطالعے کے بعد اب اس کے اُفق پر نمودار ہونے والے افکار و نظریات کو پہچانا جاسکتا ہے۔ صدیوں کے اس سفر میں برصغیر کے اندر ہمیں "طرز فکر" کی چار لہریں متوازی چلتی دکھائی دیتی ہیں، جو معاشرے میں اپنا راستہ بناتے ہوئے صدیوں سے اپنے رستے پر گامزن ہیں۔

صوفیاء اکرام

اس میں سب سے پہلے جو رونمایاں تر ہے وہ صوفیاء کی ہے۔ دکنی حکومت سے لے کر برصغیر میں انگریز کے تسلط تک اس میں کوئی تعطل نظر نہیں آتا اور یہ لوگ مسلسل مخلوق کو سکوک اور طریقت سے آشنا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اس دور کی ادبی تخلیقات دو ہی ملفوظات ہیں جو صوفیائے اکرام کے ارشادات واقوال پر مبنی ہیں۔ اردو کے ابتدائی دور کی یہ تصانیف ہر لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں ۔ ان میں نہ صرف زبان وادب کی تاریخ موجود ہے بلکہ عصری حقائق بھی موجود ہیں۔

حکمران

دوسری رو حکمرانوں کی ہے۔ جن میں کوئی ترک، کوئی افغانی، کوئی ایرانی تو کوئی تورانی ہے۔ یہ لوگ بھی خلجی سے لے کر محمد شاہ رنگیلا تک بغیر تعطل کے حکمرانی کشمکش اور سیاستوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حکمرانوں کا ذاتی کردار کچھ بھی رہا ہو، مگر ان میں سے بیشتر علم دوست تھے۔ بہت سے بادشاہ شاعر اور ادیب تھے اور شعراء اور ادباء کی قدر کرتے تھے۔ اس طبقے نے طویل عرصہ تک ادوزبان کو اس قدر نہ سمجھا کہ اس میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے، مگر رفتہ اردو کی مقبولیت نے ان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس طبقے کی تخلیقات میں سیاست کشاکش حسرت ویاس کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ عیش وعشرت کے دلدادہ شاہان ہند عشق مجازی کو موضوع بنائے رکھا۔

سیاسی علماء

بر صغیر میں اسلامی حکومت کی ابتدا سے اب تک یہ ان لوگوں کا گروہ ہے، جنہوں نے مذہب وملت کو نقصان پہنچایا۔ اپنے مفاد کی خاطر درباروں سے جڑے رہے اور بادشاہوں کی مرضی کے فتوے دیئے۔ اکبر کے دور حکومت میں اس گروہ نے دین کا سب سے زیادہ نقصان کیا، اور بہت سی خلافِ شرع باتوں کو محض بادشاہ وقت کی خوشنودی کے لے جائز قرار دے دیا۔ مذہبی علماء نے معاشرے میں مذہب کی بنتی، بگڑتی صورت حال کو سنبھالا دینے کے لیے اردو زبان میں اصلاحی، مذہبی تصانیف تخلیق کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے تراجم اور تفاسیر بھی لکھی گئیں۔

زوال یہ معاشرہ جو بیک وقت کئی تہذیبوں کا امین تھا، اس میں کوئی مشترکہ اور صحت مند فکری نظام نہ پنپ سکا۔ درباروں میں دادِ عیش دینے والے حکمران عوام کے کچھ گروہوں کے لیے قابل تقلید تھے۔ تو کچھ کے لیے قابل نفرت اور بعض کو ان کے اعمال سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حکمرانوں کی تقلید میں یہاں بے راہ روی اور خود غرضی جیسے منفی عناصر پھیل رہے تھے۔ امراء ووزراء کے ہتھیار چنگ ورباب بن چکے تھے۔ انہی منفی قدروں کی وجہ سے اس مضبوط حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے سوردکن (جس نے انسانی تہذیبوں کے مطالعے میں زندگی بسر کی) کا قول نقل کیا ہے۔

''منفی قدریں جلد یا بدیر خود ان کو فنا کر دیتی ہیں۔ جنہوں نے انہیں سینے سے لگا رکھا ہے۔ مثبت قدریں زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ ''منفی قدریں نہ صرف زندگی کو تباہ کر دیتی ہیں بلکہ خود اس کے وجود کو کھا جاتی ہیں۔''(7)

تاریخ کو دیکھیں تو عظیم بہمنی سلطنت کے تمام شاہان نے مثبت قدروں کے بل پر معاشرے کو نشاط وسکون سے ہم آہنگ کیے رکھا مگر جب انہی قدروں کی جگہ آہستہ آہستہ علاقائی تعصب، نفرت، ظلم اور ناانصافی جیسی منفی قدریں پنپنے

لگیں تو مغلوں نے ان کو مختلف حصوں میں بکھیر کر اپنے تسلط میں کر لیا۔ اسی طرح جب تک مغل وسیع تر عوامی مفاد میں متحد رہے، مضبوط رہے مگر جب وہ بھی فرقہ وارانہ کشمکش اور دوری منفی قدروں کے جنجال میں پھنسے تو فرنگیوں نے ان کو اپنا غلام بنالیا۔

ایسے میں جب کوئی اجتماعی فکری نظام نہیں پنپتا تو ہر شخص اپنے فلسفۂ حیات کی پیروی کرتا ہے۔ جس کے تحت وہ انفرادی طور پر خود ایک نظریاتی کسوٹی بنالیتا ہے جس پر وہ اپنے اعمال و افعال کو پرکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پورے عہد میں ہمیں فرد مذہب میں پناہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دکن کی حکومت ہو یا شمالی ہند افراد کی کثیر تعداد تصوف کی طرف مائل تھی۔ اس لیے ہم اکثریت کی سوچ یا فکر کو اس دور کی اجتماعی فکر کہہ سکتے ہیں۔ ان تمام مذہبی اور متصوفانہ تحریکوں خواہ وہ بھگتی تحر کی ہو یا قادریہ، چشتیہ یا نقشبندیوں کے سلسلے کا ایک پہلو کی طرف متوجہ دینے سے باقی معاشرے کی بنیادیں کمزور پڑ گئیں۔ فکری، معاشی اور سیاسی کمزوریاں بڑھنے لگیں۔ شاہ ولی اللہ جیسے جید عالم اگر اپنی تحریک کو ذرا منظم کر لیتی تو سیاسی اور معاشرتی مقاصد حاصل کر سکتے تھے۔ باطنی اور روحانی اصلاح کے چکر میں دنیا مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ حالانکہ اسلام کی تعلیمات تو یہ ہیں کہ انسان دین اور دنیا میں توازن رکھے۔ معاشرے میں تصوف کے ساتھ ساتھ حکمران طبقہ بالخصوص لہو ولہب میں غرق تھا۔

دنیا کے ہر ادب کی طرح اردو ادب کی ابتدا ہی شعر سے ہوئی اور دکنی حکومت کے آغاز ہی سے شعر و شاعری کا چرچا ہر طرف تھا۔ اردو شاعری چونکہ آغاز ہی سے فارسی کے زیر اثر رہی۔ اس لیے اس نے بھی وہی سانچے، وہی تصورات اور وہی معیارات استعمال کیے جو ایرانی اثرات کے تحت فارسی میں موجود تھے۔ شعراء کا شمار بھی اہل علم میں ہوتا تھا۔ درباروں میں بھی ان کو داد و دیش ملتی اس لیے ہر کوئی حسب استطاعت شاعری کی طرف ضرور آتا۔

دلی میں اس وقت اردو مقامی زبانوں کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے ظہور پذیر ہو رہی تھی مگر مضامیناس کے وقت بھی تصوف پر مبنی تھے۔ حالانکہ بہمنی دور کے اس شاعر کی شاعری میں نشاطیہ رجحان اور حسن پرستی بھی پائی جاتی ہے کیوں اس وقت ان علاقوں کے لوگ آسودہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ تصوف کو عام طور پر شعر کی تاثیر کے لیے بھی بہترین گردانا جاتا ہے۔ ولی کے ہاں بہتہ میں تصوف کے مختلف مسائل، حالات و کوائف اور نظریات و عقائد پر اظہار خیال ملتا ہے۔

برصغیر کی فکری روایت کے زیر اثر ولی بھی عشق مجازی کو عشق حقیقی کا ذریعہ اور وسیلہ خیال کرتے ہیں۔ اس دور کے بارے میں نور الحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔

"تصوف اس زمانے کے تمدن میں شعر و ش شاعری کے ہنگامے کا بہت بڑا محرک ہے۔ صوفیا اس عہد اور تہذیب کا ذہنی طبقہ ہیں اور تصوف ہی معیار عقل، علیت اور تہذیب و اخلاق تھا لیکن تصوف کے لئے ضروری ہو گیا ہے

عشق و عاشقی۔ اس لئے عشق و محبت، عاشی و معشوقی ان زمانوں میں نہ صرف عام ہیں بلکہ عقلی صلاحیت، اخلاقی بلند اور تہذیب نفس کی دلیل سمجھے جاتے ہیں۔(8)

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل

یہ روشنی افزا ہے آن کھیں کو لگاتی جا

ولیؔ جیسے لوگ جو عشق مجازی میں اپنے آپ کو محض اس لئے مبتلا کرتے ہیں کہ یہ حقیقی عشق کی طرف لے کر جاتا ہے۔ تصوف کے رجحان کے تحت ہی ہے۔ کیونکہ ان کے عشق مجازی کا اظہار کرنے والے اشعار میں کوئی ایسی جنسی لطافت یا گھٹا مضامین نہیں ملتے جن سے ان اشعار کو صرف عشق مجازی کے ساتھ منسلک کر دیا جائے۔ اپنے دور کی فکری روایت کی نمائندگی کرنے والے دوسرے بڑے شاعر "خواجہ میر درد" ہیں۔ جو ایک باعمل صوفی کی خوبی سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ درد نے اپنی تمام عمر خانقاہ میں گزاری اور ایک باعمل صوفی کی طرف جادو تصوف پر گامزن رہے۔ اردو کے اکثر شعراء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تصوف نظری طور پر اپنایا جبکہ دردؔ کے بارے نقادوں کی عام رائے یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کو عملی طور پر اپنایا۔ حیات و کائنات کے اسرار کو تلاش کرنے والے اور خدا کی ذات کو دنیا کی ہر چیز میں دیکھنے والے درد کہتے ہیں۔

ارض و سما کہانتیری وسعت کو پا سکے

میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

نظر میری دل کی پڑی درد کس پر

جدھر دیکھتا ہوں وہی رُو برو ہے

اپنے وقت کی روایت یعنی عشق مجازی کے ذریعے عشق حقیقی تک پہنچنے کا چلن دردؔ نے بھی اپنایا۔ مگر ان کی صوفیانہ تربیت نے ان کی شاعری کو بے راہ رو نہیں ہونے دیا۔

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ! گو حور بہشت

پر کہاں یہ خوشیاں، یہ طور، یہ محبوبیاں

کبھو ہنسنا، کبھی رونا، کبھو حیران ہو رہنا

محبت بھی کیا بھلے چنگ کو دیوانہ بناتی ہے

مرزا رفیع سوداؔ جو دکنی دور کے شاعر ہیں۔ اردو قصیدے کو جلا بخشنے والے شاعر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے قصیدے میں متنوع مضامین و موضوعات کو شامل کیا مگر ان کی شاعری میں بھی ایک واضح رجحان حکیمانہ خیالات اور اخلاقی تعلیمات کے بیان کا ہے۔ یہ دراصل اس عہد میں تصوف کی جاری و ساری لہر کے تحت ہی تھا۔ ان کے قصائد میں بزرگان دین اور

ارباب دنیا کی مدح کے بارے میں قصائد شامل ہیں۔ نبی اکرم ﷺ، حضرت سیدہ فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور دیگر آئمہ کے قصائد ہیں۔ دنیاوی عظماء میں عالمگیر ثانی، شاہ عالم، آصف جاہ، شجاع الدولہ وغیرہ کی مدح بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ برصغیر کے معاشرتی اور سماجی حالات میں اس دور کے بارے میں بتایا گیا کہ شاعر درباروں سے داد و انعام پاتے تھے۔ اس لئے قصیدے اور مدح کی طرف خاص رجحان تھا۔

یارو مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک

میں، کناں،ب بلبل، پروانہ بہم چاروں ایک

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اس وقت اردو شاعری اگرچہ کاکل و رخسار اور دہن و کمر کے افسانوں پر تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات سے متاثر تھی۔ برصغیر کی مسلم حکومت کے زوال کی پوری داستان ان شعراء کے کلام میں موجود ہے۔

رُوبہ زوال اس معاشرے کے افراد میں دنیا کی بے ثباتی، فکر روزگار اور تہذیبی انحطاط کے احساسات کو گہرا کر دیا گیا۔ سودا کا قصیدہ ''تضحیک روزگار'' دراصل اس وقت کے فوجی نظام پر طنز ہے۔ میرؔ کا شہر آشوب، مخمس، ''حال لشکر'' اور مثنوی ''در بیان کذب'' اعمراء کی اخلاقیات کا معیار اور زمانے کی بدحالی کے وہ نقشے ہیں۔ جنہوں نے مل کر افراد معاشرہ کو بے یقینی کی فضا میں معلق کر دیا۔

دُنیا میں آسودگی رکھتی ہے فقط نام

عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کہ کوئی اس کانشاں ہے

احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد ہندوستانی فوجوں کو معاشی بدحالی کو میرؔ یوں بیان کرتے ہیں:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش

نے دم آب ہے نہ چمچہ نہ آش

آئے لشکر میں ہم برائے تلاش

آن کے دیکھی یاں کی طرف معاش

ہے لب نان پہ سو جگہ خاش

معاشرہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا تھا۔ اس درماندگی اور زبوں حالی میں اب تصوف کے بھی کئی پہلو کھل کر سامنے آئے، حساس اور گداز طبیعت لوگوں کے لئے یہ تمام حالات بہت تکلیف دہ تھے۔ دنیا اور علائق دنیا سے بے تعلق، دنیا کی بے ثباتی، جبر و قدر اور توکل و صبر کے خصائص، ہجر و فراق کے قصے نالہ و فریاد، غم و اندوہ اور بے جا قناعت و

صبر اردو شاعری کے موضوعات بنے۔ شکستگی اور درماندگی کے یہ اثرات دنیا کی بے ثباتی اور معاشرے میں بے یقینی کی فضا سے پیدا ہوئے۔ جس کو تصوف نے مزید پختہ کر دیا۔

جب کسی معاشرے کے افراد کی اکثریت یکساں نظام فکر میں منسلک ہو جاتی ہے تو کوئی ذی ہوش اس کے اثرات سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسی دور کی لکھنوی اردو شاعری اور شعراء کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہاں سیاسی اور معاشی حالات بہتر ہونے کی وجہ سے عیش و طرب اور مجازی محبوب کے نغمے بلند ہوتے رہے مگر آتش جیسا عشق مجازی کا شاعر بھی تصوف کی اجتماعی رو سے نہ بچ سکا۔ ان کے ہاں مقام فنا، ریاضت و صفائے باطن، مظاہر خداوندی، تجلیات الٰہی کی رنگارنگی، مقام حیرت اُسی اجتماعی فکر کا اثر ہے جو اس وقت برصغیر میں موجود تھی۔

غرض یہ کہ برصغیر کے کسی علاقے یا حصے کو اردو شعراء یا ادباء (نثر اس وقت تک اتنی عام نہ تھی) کے فن کا مطالعہ کریں تو تصوف اور اس کی خصوصیات ہی اس پر چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سیاسی مرکزیت عوام میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے مگر جب سیاسی حالات قابو سے باہر ہو جائیں تو آہستہ آہستہ معاشرتی نظام کا سارا سلسلہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی نے جب اہالیان ہند کا رہا سہا سکون بھی غارت کر دیا تو اخلاقی معیار مزید پست ہوتا چلا گیا۔ دنیا سے عدم دلچسپی نے ان لوگوں کو داخلیت کی طرف موڑ دیا اور اس زمانے میں پیدا ہونے والا ادب چاہے وہ نظم ہو یا نثر "ادب برائی ادب" کے نظریے کے تحت ہی وجود میں آیا۔ جیسا کہ شارب ردولوی نے کہا:۔

"جب کوئی صحت مند سماجی و سیاسی نظام نہ ہو۔ مستقبل پر سے عوام کا اعتماد اُٹھ چکا ہو اور اپنے سماجی ماحول سے فنکار ہم آہنگ نہ ہو۔ ایسے تمام حالات میں انسان زندگی کی حقیقتوں سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اور یہ فرار اسے عام طور پر دو چیزوں سے ملتا ہے۔ غم، اُداسی، کرب اور مایوسی وغیرہ یا پھر شاہد و جام، باقی و پیمانہ اور عاشقی و بوالہوسی میں۔ ایسے تمام ادیبوں سے لطف و مسرت حاصل کرنے اور حظ اٹھانے کا جذبہ جس سے ادب میں خارجی لوازمات کے ذکر اور معاملہ بندی کو راہ ملی۔ (9)

اب اس تمام عہد جو انگریز کے تسلط کے بعد کا ہے، کے اردو ادب کا جائزہ لیں تو وہ میرؔ ہوں یا غالبؔ ہر ایک کے ہاں کرب اور قنوطیت کی فضا ملتی ہے اور کبھی دکھوں اور تکالیف کے باعث ایک جھنجھلاہٹ کا احساس ہے۔ اس وقت تصوف کی تمام خصوصیات بھی دم توڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز کے تسلط کے بعد کوئی ایسا باعمل صوفی دیکھنے کو نہیں ملتا جس نے اجتماعیت کیلئے کام کیا ہو۔

اہالیان ہند کی سوچ کو نئے رُخ عطا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر اقبال جیسے لوگوں کو بھیج دیا جنہوں نے ان کو مایوسی اور ناامیدی کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکال کر امید کے نئے افق سے روشناکروایا۔ ذہنی جمود کا دور ختم ہونے

کو تھا اور اقبال اسلامی فکر کی تشکیل نو نے برصغیر کو پھر سے ترقی کی پر گامزن ہونے کا عزم دیا اگرچہ جغرافیائی صورتحال بدل گئی مگر اس کو بدلنے کے لئے جو عزم تھا وہ اسی اجتماعی فکر نے دیا جو ان کے اندر استحصالی دور میں آہستہ آہستہ پیدا ہوئی۔

خلاصہ

ان تمام تفاصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں جب ''اُردو'' نے بحیثیت زبان آنکھ کھولی تو برصغیر کے لوگوں پر سخت مصیبت اور پریشانی کا عالم تھا۔ معاشرتی و سماجی قدریں مفقود ہو رہی تھیں۔ حکمرانوں کی آپس کی چپقلش نے معاشی بدحالی بھی پیدا کر دی تھی۔ غیر اخلاقی رویے پنپ رہے تھے اور شرفاء کے لئے زمین تنگ ہو رہی تھی۔ اسی سیاسی پستی نے عوام کے اندر سے خود اعتمادی اور اس کا رُخ داخلیت کی طرف موڑ دیا۔ اس کے اندر قنوطیت بھر دی مگر ایسے میں مذہب نے اسے پناہ دی۔ مذہب کی یہ پناہ اسے تصوف کی شکل میں ملی۔ تصوف نے اسے روحانیت کی تربیت اور اخلاقی نصب العین عطا کیا اگرچہ تصوف کی بعض منفی شکلوں نے امر پرستی کو فروغ دیا مگر اچھے فنکاروں نے اس کے اندر اُتر کر عشق حقیقی کے گوہر نایاب کو پایا۔ جن علاقوں میں سیاسی معاشرتی زبوں حالی کے باعث زندگی عدم تحفظ اور بے یقینی کا شکار تھی وہاں کے شعراء کی اُردو شاعری میں بھی اس کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ تصوف کے زیر اثر اخلاقی پستی اور اخلاقی گراوٹ سے محفوظ رہے جبکہ لکھنؤ جیسے علاقے جو ایسی ریشہ دوانیوں سے محفوظ تھا۔ وہاں کی اُردو شاعری عشق مجازی اور لذت و مسرت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ادب کو زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ پرکھنے سے اس کی اصل روح سامنے آجاتی ہے کیونکہ ادب اور سماجی زندگی کا آپس میں گہرا رشتہ ہے جو فنکار اپنے موجودہ ماحول سے کٹ کر فن پارے تخلیق کرتا ہے وہ سطحی اور کمتر سوچ کا مالک ہوتا ہے اس کے فن پاروں کو بھی لافانیت حاصل نہیں ہو پاتی۔ کسی بھی عہد کی ''اجتماعی فکر'' ادب کی اصل روح ہوتی ہے۔ اس تک رسائی حاصل کئے بغیر انفرادی یا اجتماعی طور پر اس دور کے کسی فن کار یا فن پارے کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا ہے اور اس اجتماعی فکر کو کھوجنے کے لئے اس عہدے کے تمام معاشی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کو تحقیق کی بھٹی سے گزارنا پڑتا ہے۔ اب جن حالات کی تفصیل اس مضمون میں دی گئی ہے اُن کو مد نظر رکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ کی معاشی ابتری کے باعث وہاں کی شاعری ''غم روزگار'' میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ روحانی سکون کی تلاش میں تصوف کے حصار میں ہے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تخلیق ہونے والے ادب میں غم دوراں اور ہستی کی بے ثباتی کو بیان کیا گیا ہے۔ اُردو ادب میں نئی ''فکر'' کی بنیاد اس وقت پڑی جب انیسویں صدی کے آخر میں انگریز یہاں پر قابض تھا اور بادشاہوں سے ملنے والے جاگیر دارانہ نظام کو برصغیر کے عوام پر مسلط کیے ہوئے تھا۔ اس وقت یہ عوام ایک نئی کشمکش میں گرفتار تھے۔ زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے نئی تہذیب اور جدید علوم کو اپنانے کی کشمکش۔ اُس دور کے اُردو ادب میں باقی نقوش تو ذرا دھندلے ہیں مگر سب سے نمایاں نسلی تعصب ہے۔ جاگیر دارانہ نظام اور غیر ملکی حکمران کیخلاف نفرت کا برملا اظہار ہے۔ اس دور سے ذرا آگے آئیں تو ان دھندلکوں سے نئے مستقبل کی تلاش کی خواہش

روشن تر نظر آتی ہے۔ جس میں سیاسی، س ماجی اور اخلاقی اصلاحات کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ اقبالؒ جیسے مصلحین اپنی "فکر" کی طاقت سے ایک پژمردہ قوم میں زندگی کی رُوح پھونکتے دکھائی دیتے ہیں۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات (References)

1. جمیل جالبی، ڈاکٹر "ادب، کلچر اور مسائل" 1987ء کراچی، رائل بک کمپنی، ص13
2. عبدالحق، مولوی "اُردو ادب کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے اکرام کا حصہ"، ص24
3. رام بابو سکسینہ مترجم محمد حسن عسکری "تاریخ ادب اُردو" لاہور مکتبہ عالیہ س ن، ص51
4. نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر "دلی کا دبستان شاعری" 1989ء کراچی، اُردو اکیڈمی، ص17
5. محمد اکرام، شیخ "آبِ کوثر" ص29
6. "نقوش عصری ادب نمبر" 1982، لاہور ادارہ فروغ اُردو، ص14
7. جمیل جالبی، ڈاکٹر "ادب، کلچر اور مسائل" 1987ء، ص299
8. نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر "دلی کا دبستانِ شاعری"، ص36
9. شارب ردولوی "جدید اُردو تنقید، نظریہ و عمل" 1996ء، لکھنؤ اُردو اکادمی، ص35
10. *Khan, Muhammad Bahar, Saad Jaffar, Sardar Muhammad, Muhammad Waseem Mukhtar, Waqar Ahmad, and Bushra Rasheed. "Partitioning the subcontinent in 1947: A move of west against the stability of Islam using applicable geopolitical laws." Russian Law Journal 11, no. 1 (2023): 157-165.*
11. جمیل جالبی، ڈاکٹر "ادب، کلچر اور مسائل" 1987ء، کراچی رائل کمپنی، ص39
12. جمیل جالبی، ڈاکٹر "تاریخ ادب اُردو" (جلد اوّل) 1989ء دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہائوس
13. جمیل احمد، انجم "کلاسیکی شاعری" 2002ء، لاہور علمی کتاب خانہ، ص19
14. رام بابو سکسینہ (مترجم محمد حسن عسکری) تاریخ ادب اُردو 1990ء، لاہور، مکتبہ عالیہ، ص35
15. سلیم اختر، ڈاکٹر "اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" 2003ء لاہور، سنگ میل پبلشرز، ص27
16. شارب ردولوی "جدید اُردو تنقید، نظریہ و عمل" 1996ء لکھنؤ، اُردو اکادمی، ص13
17. شیخ محمد اکرم "آبِ کوثر" 1984ء (ایڈیشن 10) لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ص28
18. مولوی عبدالحق "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ" 1988ء دہلی، غالب اکیڈمی، ص17
19. نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر "دلی کا دبستانِ شاعری" 1989ء کراچی، اُردو اکیڈمی، ص12